© rasailojaraid.com

قومیّت اور وطنیّت کی تحریک کا فروغ

اور

اس کا اسلامی حل

(۲)

جناب پروفیسر سیّد محمد سلیم صاحب

اس قوم پرستی میں لازماً چار عناصر پائے جاتے ہیں۔

۱۔ قوم پر فخر کرنے کا جذبہ:۔

یہ جذبہ اپنی قومی روایات اور خصوصیات کی محبت کو پرستش کی حد تک بڑھا کر لے جاتا ہے۔ دوسری قوموں کے مقابلہ میں ہر لحاظ سے اپنی قوم کو بالا اور برتر قرار دیتا ہے۔

۲۔ قومی حمیّت کا جذبہ:۔

یہ جذبہ حق و انصاف کے سوال کو نظر انداز کر کے آدمی کو ہر حال میں اپنی قوم کا ساتھ دینے پر آمادہ کرتا ہے خواہ وہ حق پر ہو یا ناحق پر۔

۳۔ قومی تحفظ کا جذبہ:۔

یہ جذبہ قوم کے واقعی اور خیالی مفادات کی حفاظت کے لیے ہر قوم کو ایسی تدابیر اختیار کرنے پر آمادہ کرتا ہے جن کا آغاز تو مدافعت سے ہوتا ہے لیکن جن کا اختتام حملہ آور ہونے پر ہوتا ہے۔ مثلاً غیر قوموں کی مہاجرت پر پابندی عاید کرنا۔ ان کی تعداد کو تشویش کی نگاہ سے دیکھنا، اپنے حدود میں دوسروں کے لیے کسبِ معاش اور شہری

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حقوق کے دروازے بند کر دینا، ملکی دفاع کے لیے بڑھ چڑھ کر فوجی قوت فراہم کرنا۔ دوسرے ملکوں میں اپنی قوم کے حقوق کی حفاظت کے لیے دوڑ جانا۔ ہر طرح معاشی مفادات کی حفاظت کرنا۔

۴۔ فخر و مباہات کا جذبہ:۔

شروع میں تو یہ قومی افتخار تک ہی محدود رہتا ہے مگر بعد میں یہ داعیہ ابھرتا ہے کہ دوسری قوموں پر غالب اور برتر ہوں۔ دوسروں کے خرچ پر اپنی خوشحالی بڑھائیں۔ دوسروں میں اپنی تہذیب و ثقافت پھیلائیں۔ اور دوسری کمزور قوموں کا استحصال کریں۔

قوم پرستی کے اس نشہ سے سرشار ہو کر یورپ کا ہر ملک انا ولا غیری کا نعرہ بلند کرنے لگا۔

جرمن ——— "جرمنی سب سے بلند و بالا ہے۔"

امریکی ——— "امریکہ خدا کا اپنا ملک ہے۔"

برطانوی ——— "حکومت کرنا برطانیہ کا حق ہے۔"

اطالوی ——— "اطالیہ کی تقدیس ہی مذہب ہے۔"

ہر ملک کا یہ قومی عقیدہ ہے "میرا ملک خواہ حق پر ہو یا ناحق پر ہو۔"

قوم پرستی کا مطلب صرف یہ نہیں ہے کہ آدمی اپنی قوم سے محبت رکھتا ہے اور اس کو آزاد اور خوشحال اور برسر ترقی دیکھنا چاہتا ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو بہت اچھا ہوتا۔ یہ تو ایک شریفانہ جذبہ ہے۔ مگر قوم پرستی درحقیقت عداوت، نفرت اور انتقام کے جذبات کو جنم دیتی ہے اور پرورش کرتی ہے۔ بظاہر اس کا آغاز ان بے انصافیوں کی تلافی کرنے کی غرض سے ہوتا ہے جو کسی قوم کے ساتھ کسی دوسری قوم یا قوموں نے واقعی یا خیالی طور پر کی ہوں۔ مگر چونکہ کوئی اخلاقی ہدایت، کوئی روحانی تعلیم کوئی الٰہی شریعت اس کی رہنمائی کرنے والی اور اس کو ضابطہ میں رکھنے والی نہیں ہوتی۔ اس لیے یہ جذبات اپنی حد سے گزر کر جارحیت، معاشی قوم پرستی، نسلی منافرت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جنگ اور بدامنی میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔

قوم پرستی کا ایک تقاضا یہ بھی ہے کہ اس کی غیرت قومی اس بات کو کسی طرح گوارا نہیں کر سکتی کہ وہ ایسے لوگوں کو بزرگ سمجھے اور ہیرو بنالے جو اس کی اپنی قوم کے نہیں ہیں۔ وہ اس کو بھی گوارا نہیں کر سکتی کہ ایسے مقام کی مرکزیت، تقدیس اور احترام کو قبول کرے جو اس کے اپنے وطن کے نہیں ہیں۔ ایسی زبان کا تہذیبی اثر قبول کرے جو اس کی اپنی زبان نہیں ہے۔ ان روایات سے روحانی فیض حاصل کرے جو خارج سے درآمد کردہ ہوں۔ وہ ان سب چیزوں کو نہ صرف بدیسی قرار دیتی ہے بلکہ انہیں اسی نفرت اور ناگواری کی نظر سے دیکھتی ہے، جس طرح بیرونی حملہ آوروں کی ہر شے دیکھی جاتی ہے۔ وہ ہر قسم کے خارجی اثرات کو اپنی قومی زندگی سے نکال دینے کی کوشش کرتی ہے۔ اس کے جذبۂ قوم پرستی کا فطری تقاضا یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی سرزمین، دریاؤں، پہاڑوں اور صحراؤں کی تقدیس اور حمد کے گیت گاتا ہے۔

ہٹلر کے دور میں نازی جرمنی قوم پرستی کی معراج کو پہنچا ہوا تھا۔ اس زمانہ میں بعض جرمنوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے علانیہ بیزاری کا اظہار کیا تھا۔ اس لیے کہ وہ یہودی النسل تھے۔ وہ آریہ نہیں تھے۔ لیکن جن نازیوں کے دل میں ابھی تک حضرت مسیح کے لیے نرم گوشہ باقی تھا وہ ان کو یہودی نہیں مانتے تھے۔ بلکہ نارڈک نسل کا مانتے تھے۔ ایسا ہی ایک واقعہ علامہ شکیب ارسلان نے لکھا ہے۔ جنگ عظیم اول — (۱۹۱۴ء-۱۹۱۸ء) سے قبل وہ ترکی میں ریل میں سفر کر رہے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ترکوں میں تورانی قوم پرستی کی تحریک اپنے عروج پر تھی اور عربوں سے نفرت تھی — ایک ترک کہہ رہا تھا کہ عرب ذلیل ہیں، عزت کے تصور سے ہی آشنا نہیں ہیں۔ "میں نے بیچ میں لقمہ دیا کہ یہ عزت کا لفظ کس زبان کا ہے"۔ اس نے بڑی ڈھٹائی سے جواب دیا — "ترکی ہے"۔

جرمنوں کے نزدیک دین و ایمان سب کچھ جرمنی تھا۔ اور جرمنی کا قائد اڈولف ہٹلر تھا۔ جس کا اظہار ایک نازی وزیر ہر فریڈرک نے اس طرح کیا ہے:

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

"ہٹلر کی خدمت کرنا جرمنی کی خدمت کرنا ہے۔ اور جرمنی کی خدمت کرنا خداوند تعالیٰ کی خدمت کرنا ہے۔ ہٹلر کا ہر فیصلہ خیر ہے اور ابد تک خیر رہے گا۔ ہٹلر کی خدمت کے لیے ہر ذریعہ استعمال کیا جا سکتا ہے، خواہ بظاہر وہ غیر اخلاقی نظر آئے۔"

قوم پرستی کی تحریک بالآخر اس نقطۂ کمال پہ پہنچ کر رہتی ہے۔ اطالیہ میں یہی ہوا۔ فرانکو کے اسپین میں یہی ہوا۔ قوم پرستی کی کوئی تحریک ابھی درمیانِ سفر ہی ہے تو ضرور ایک دن وہ اس منزل پہ جا کر دم لے گی۔ دنیا کے ہر قوم پرست اور وطن پرست کے نہاں خانۂ دل کی آواز تو یہی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ہر قوم پرست اس جرأت اور بے باکی کے ساتھ اپنا مدعا ظاہر کرنا پسند نہیں کرتا جس بے باکی سے ہر فریڈرک نے ظاہر کر دیا۔

اقلیتوں کی زبوں حالی

قوم پرستانہ حکومت کے اندر دین، مذہب، اخلاق، حقوق کی کوئی ضمانت نہیں۔ قومی حکومت کی دراز دستیاں جس کا چاہیں حلیہ بگاڑ سکتی ہیں کوئی پوچھنے والا نہیں کوئی ہاتھ روکنے والا نہیں۔ سب سے زیادہ بُرا حال قوم پرستانہ تحریک کے اندر اقلیتوں کا ہوتا ہے۔ خواہ وہ اقلیتیں مذہبی ہوں، لسانی ہوں، نسلی ہوں یا کسی اور نوعیت کی ہوں وہ اکثریت کے رحم و کرم پہ ہوتی ہیں، وہ جیسی چاہے ان کی درگت بنا لے۔ اکثریت کی اندرونی خواہش یہ ہوتی ہے کہ اقلیت کے اندر شکست و ریخت کا عمل جاری ہو۔ اور وہ اقلیت اکثریت کے اندر مدغم ہو جائے۔ ان کا جداگانہ وجود ختم ہو جائے۔ خواہ ملکی دستور میں اقلیتوں کے تحفظ کی کیسی ہی معرکہ آرا ضمانتیں درج ہوں۔ سابق دور میں ظلم و ستم کے خلاف اقلیتیں بادشاہ یا حکمرانوں سے اپیل کر سکتی تھیں۔ خدا کے نام پہ رحم کی درخواست کر سکتی تھیں۔ مگر قومیت کے دور میں یہ سب کچھ نہیں ہو سکتا۔ وطنیت کے دیوتا کے کان بانسولی سے بہرے ہوتے ہیں۔ اقلیتوں کی آہ و بکا کی وہاں رسائی نہیں ہوتی۔

ہٹلر نے یہودی اقلیت کو بالکلیہ ہلاک کر دینے کا منصوبہ بنایا۔ واضح رہے کہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جنگِ عظیم اوّل میں جرمنی کے یہودیوں نے استحادیوں انگریزوں کے ساتھ سازش کر کے جرمنی کو شکست سے دوچار کر دیا تھا۔ جس کے نتیجے میں انگریزوں نے یہودیوں کو فلسطین کا تحفہ عطا کیا۔ (اعلان بالفور ۱۹۱۷ء) اس غداری کا ہٹلر نے یہودیوں سے سخت انتقام لیا۔ مختلف طریقوں سے ان کو ہلاک کرنے کی اسکیمیں بنائیں۔ مثلاً ایئر کنڈیشنڈ بسوں میں یہودیوں کو مختلف مقامات سے لایا جاتا تھا۔ راستہ میں بس میں سے ساری ہوا کھینچ لی جاتی تھی۔ دم گھٹنے سے سب مر جاتے تھے۔ بعض جگہ یہودیوں کو افقی طور پر مشرق رویہ اور شمال رویہ اوپر تلے لٹا دیا جاتا تھا۔ جس طرح ٹال میں لکڑیاں چنی جاتی ہیں۔ پھر اُن پہ چونا ڈال دیا جاتا تھا۔ اوپر سے پانی چھوڑ دیا جاتا تھا۔ چونا پکتا تھا، کھدکھداتا تھا۔ زندہ انسان اس میں جھلس جاتے تھے، جل کر کوئلہ ہو جاتے تھے۔ اُن کے لیے ایک گیس چیمبر بنایا گیا تھا۔ اس میں زندہ انسانوں کو پھینک دیا جاتا تھا۔ چھ فٹ کا آدمی سکڑ کر تین فٹ کا بونا بن جاتا تھا۔ یہودیوں کی مردہ لاشوں کو بھٹی میں جلایا جاتا تھا چربی علیحدہ نکالی جاتی تھی جس سے صابن بنایا جاتا تھا۔ چہرہ کی کھال سے عورتوں کے لیے پرس تیار کیے جاتے تھے۔ ہڈیوں کو پیس کر کھیتوں کے لیے کھاد تیار کی جاتی تھی۔ دوسری جنگِ عظیم کے خاتمہ کے بعد جرمنوں کے خلاف استحادیوں نے مقدمات قائم کیے۔ ان میں یہ تفاصیل بیان کی گئی ہیں۔ (NUREM BERG TRIALS)

حکمران اکثریت اگر اقلیت کے مقامِ رہائش سے کسی نوع کا خطرہ محسوس کرتی ہے تو اقلیت کو وہاں سے اکھاڑ کر کہیں دور پھینک دیتی ہے۔ کریمیا یورپ میں تاتاری مسلمان گذشتہ چھ صدیوں سے آباد چلے آ رہے تھے۔ دوسری جنگِ عظیم کے بعد روس کے ڈکٹیٹر اسٹالن نے فیصلہ کیا کہ ایسے حساس علاقہ پر مسلمان اقلیت کا موجود ہونا خطرے سے خالی نہیں ہے۔ اس کے بعد بغیر پیشگی اطلاع کے، بغیر کسی آباد کاری اسکیم کے، ایک رات سارے علاقے کو روسی فوجوں نے گھیر لیا۔ لاکھوں تاتاریوں کو ٹرکوں میں لاد کر تین ہزار میل دور سائبیریا کے برفستانوں میں لے جا کر چھوڑ دیا۔ جہاں لاکھوں انسان بے گھر، بے در سردی میں ٹھٹھر ٹھٹھر کر مر گئے۔ کوئی اُن کا پُرسانِ حال

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نہیں تھا۔

حکمران اکثریت اگر اقلیت کی شرح پیدائش سے خطرہ محسوس کرتی ہے تو زبردستی ان کی آبادی کم کی جاتی ہے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی شرح پیدائش سے خطرہ محسوس کر کے اندرا گاندھی نے مسلمان مردوں کو زبردستی خصی بنانے کا منصوبہ بنایا۔ رات کو مسلح پولیس مسلمانوں کے محلوں کا محاصرہ کر لیتی تھی۔ گھر میں گھس کر مردوں کو پکڑتی۔ اس شور و واویلا میں ڈاکٹر اُن کو خصی کر ڈالتے تھے۔ جس کے بعد کسی طبی امداد کی اور نگرانی کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی جاتی تھی۔

اقلیتوں کی زبان محفوظ نہیں رہتی۔ پولینڈ اور یوگوسلاویہ میں آباد ترکوں اور تاتاریوں کو وہاں کی حکومت مجبور کر رہی ہے کہ وہ ترکی زبان ترک کر دیں۔ اقلیتوں کا اپنا رسم الخط محفوظ نہیں۔ صدیوں سے رائج ترک اقوام میں عربی رسم الخط کو روسی حکومت نے متروک قرار دے دیا ہے اور روسی خط اختیار کرنے پر مجبور کیا۔ ماوزے تنگ نے چین میں اویغور زبان کا رسم الخط عربی سے لاطینی میں تبدیل کر ڈالا۔ روس، یوگوسلاویہ اور ہندوستان میں لاکھوں مساجد پر تالے ڈالے گئے ہیں۔ دینی کتب ضبط کر لی گئی ہیں۔ (روس) دینی تعلیم ممنوع ہے۔ یوگوسلاویہ میں ترکی نام رکھنے کی اجازت نہیں ہے، ختنہ کرانے سے روکا جا رہا ہے۔ انگلستان جیسے آزاد ملک میں بھی مساجد میں اذان دینے پر پابندی ہے، جانور ذبح کرنے پر پابندی ہے۔ وطن پرستی اور قوم پرستی کے تحت اقلیتوں کی زندگی اجیرن ہے۔ وہ اکثریت کے ہاتھوں میں ایک کھلونا ہیں اقلیتیں سخت تنگی میں زندگی بسر کرتی ہیں۔

قوم پرستی عالمِ مشرق میں ایشیا اور افریقہ کے ممالک اپنی طویل تاریخ میں وطنی تصور قومیت سے نا آشنا تھے، بیگانہ تھے۔ یہ پودا یورپی اقوام نے حکمران بن جانے کے بعد محکوم قوموں میں افتراق اور انتشار پیدا کرنے کے لیے لگایا ہے۔ انہوں نے وطنی اکثریت اور وطنی اقلیت کے نسخہ کو خوب آزمایا۔ حکومت کرنے میں اس کو بڑا مفید پایا۔ وطنی قومیت کے مسلک میں کسی گروہ کو یہ کہہ دینا کہ وہ غیر ملکی ہے، بدیسی ہے اس کو کافر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

قرار دینے اور شیطان قرار دینے کے مترادف ہے۔ پھر اس بیچارے مظلوم گروہ کا نہ کوئی حامی و ناصر اور نہ پرسانِ حال۔

نپولین پہلا شخص ہے جس نے یہ حربہ آزمایا۔ ۱۷۹۹ء میں اس نے مصر پر حملہ کیا۔ اپنے حملہ کے جواز میں اس نے اپنے اس "نیک عزم" کا اظہار فرمایا کہ:

"ایک مدت سے مصر پر غیر ملکی لوگ حکمران ہیں۔ ان کو نکال کر مقامی عربوں کو حکمران بنانے کے لیے میں یہاں آیا ہوں۔ عرب شاندار تاریخ رکھنے والی ایک قوم ہے اور آئندہ بھی وہ شاندار کارنامے انجام دے گی۔"

نپولین یہاں جن حکمرانوں —— مملوکوں —— کو غیر ملکی قرار دے رہا ہے وہ مصر میں کئی صدیوں سے چلے آ رہے تھے۔ مسلمانوں کو بیوقوف بنانے کے لیے اس نے یہ شوشہ بھی چھوڑا تھا کہ وہ مسلمان ہو گیا ہے۔ سادہ لوح مسلمان اس سے بہت خوش ہو گئے، حالانکہ یہ استعمار کی چالیں تھیں۔

نپولین کے اس اعلان کی سب سے زیادہ قدر افزائی ہندوستان کی انگریزی حکومت نے کی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت نے اس سے شہ پاکر ایک ملازم کے ذریعہ اعلان کرایا کہ "ہندو ہندوستان کے اصل باشندے ہیں اور مسلمان غیر ملکی ہیں، بدیسی ہیں"۔ یہ سب کچھ ہندو اکثریت کو خوش کرنے کے لیے کیا گیا۔ اس سادہ سے جملے نے ہندو اور مسلمانوں کے درمیان نفرت اور حقارت کا بیج بو دیا۔ اس درخت کے کڑوے پھل فسادات اور قتل و غارت گری کی صورت میں مسلمان گزشتہ پونے دو صدیوں سے چکھ رہے ہیں۔ پہلا ہندو مسلم فساد انگریزی حکومت میں اس شوشہ کے چھوڑنے کے چند سالوں بعد ۱۸۰۹ء میں ہوا تھا۔ مغل دورِ حکومت میں کسی ہندو مسلم فساد کا پتہ نہیں چلتا۔

مشنری اور مستشرقین استعمار کے ہراول دستے ہیں۔ مسلمان ملکوں میں وطنی قومیت کا بیج اگانے، آبیاری کرنے اور فصل تیار کرنے کی بھرپور کوشش مستشرقین اور مورخین نے کی ہے۔ پروفیسر براؤن ایک ہمدردِ ایران مستشرق سمجھے جاتے ہیں۔ ان کی کتاب "تاریخ ادبیاتِ ایران" کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ قوم پرستی کے بیج بونے میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

وہ کسی سے کم نہیں ہیں کسی بھی ادیب، شاعر، اہلِ علم کا ذکر آئے تو وہ یہ بتانا اپنا فریضہ سمجھتے ہیں کہ وہ ایرانی تھا، ترک تھا، عرب تھا، کرد تھا یا نومسلم یونانی تھا۔ اس طرح غیر شعوری طور پر قاری کے لاشعور میں وہ قوم پرستی کی تخم ریزی کرتے ہیں۔ اسلام کے آفاقی تصور قومیت پر چرکے لگاتے ہیں۔ تقریباً سارے مستشرقین کا یہی حال ہے۔ آج کل عالم میں اسلامی نظام حکومت اور اسلامی نظام عبادت کی صدائیں بلند ہو رہی ہیں تو مستشرقین نے اس سے رُخ موڑنے کے لیے بالواسطہ تصوف اور صوفیاء کے گُن گانے شروع کر دیئے ہیں۔ مارٹن لنگ، رینے گینوں، اینی شمل سب اسی "کارِ خیر" میں مصروف ہیں۔

مغربی مورخین نے مسلمان ملکوں میں اسلام سے ماقبل کی تاریخ کو کھود کر نکالا ہے اس پر فخر و مباہات کے پھول برسائے۔ انہوں نے مصر میں فراعنہ کے دور کو، شام میں فینیقی عہد کو، عراق میں کلدانی اور بابلی تہذیب کو، ایران میں ہخامنشی اور ساسانی دور کو اور پاکستان میں موئن جو دڑو اور گندھارا تہذیب کو بڑے آب و تاب کے ساتھ پیش کیا۔ مسلمان ممالک میں قدیم تہذیبوں سے متعلق اشیا کو عجائب خانوں میں نمایاں کیا گیا ہے۔ کثرت سے حاصل کر کے رکھا گیا ہے۔ ان میں اسلامی دور کی اشیاء بہت قلیل ہیں اور غیر جاذب ہیں، اس طرح کہ غیر شعوری طور پر ناظر کے دل میں اسلام کے مقابلہ میں قدیم تہذیب کی عظمت بیٹھ جائے۔ وہ غیر اسلامی دور پر فخر کرنے لگے۔ ان ممالک میں وطنی قومیت کی بنیاد غیر اسلامی تہذیب پر رکھی گئی ہے۔ اسلامی دور سے ذہنوں میں بُعد پیدا کیا گیا ہے۔ یہ مغربی اقوام ہیں جنہوں نے اپنے دورِ حکومت میں مشرقی اقوام کے اندر وطنی قومیت کی آبیاری کی اور پروان چڑھایا۔ انگریزی مورخ آرنلڈ ٹائن بی اعتراف کرتا ہے:

"نسل پرستی کی لعنت ہم نے (انگریزوں نے) پوری دنیا میں پھیلائی ہے۔ یہ اینگلو سیکسن اقوام کا پرانا مرض ہے۔ جو اب ساری دنیا کو لگ گیا ہے۔"

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مزید برآں وہ اعتراف کرتا ہے:

"مختلف قوموں اور نسلوں کو پُرامن ماحول مہیا کرنے میں اسلامی تہذیب کو جو غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی ہے وہ کسی دوسری تہذیب کو حاصل نہیں ہوئی"۔

EAST VERSKS WEST - BY ARNOLD TOYANBEE

بہر حال اب وطنی قومیت کا درخت عالم مشرق میں بھی برگ و بار لا رہا ہے۔ یہاں بھی اکثریت اور اقلیت کی آویزش شروع ہو چکی ہے۔ یہاں بھی اکثریت کے طور طریقے جابرانہ ہیں۔ دوسرے لوگ اس سے نالاں ہیں۔ اور اگر بحسن اتفاق سے وہ نالاں اقلیت حکمران بن جاتی ہے تو اس کے طور طریقے سابق حکومت سے قطعاً مختلف نہیں ہوتے۔ پھر وہی دورِ استبداد کا دور دورہ ہوتا ہے۔

زمامِ کار اگر مزدور کے ہاتھوں میں ہو پھر کیا
طریقِ کوہ کن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی

حقیقت یہ ہے کہ

صاحب نظراں! نشۂ طاقت ہے خطرناک

وطنی قومیت کے منفی رجحانات

زبان اور نسل کی بنا پر انسانوں کی شیرازہ بندی عالم مشرق میں خطرناک اور عدمِ استحکام کی حامل ہے۔ چند دور دراز جزائر کو مستثنیٰ قرار دینے کے بعد دنیا کا کوئی ملک نہ یک لسانی ہے اور نہ یک نسلی۔ وہاں ایک لسانی اکثریت اور ایک نسلی اکثریت کا صاف اقتدار ہونا دوسری لسانی اور نسلی اقلیتوں کو کسی طور قابلِ قبول نہیں ہو سکتا۔ ان کے مابین آویزش و چپقلش لازماً پیدا ہوتی ہے۔ پھر وطنی اکثریت اقلیت کی جو درگت بناتی ہے اس کا مختصر سا تذکرہ اوپر گزر چکا ہے۔ اِس طرزِ حکومت سے نہ استحکام اور نہ سکون حاصل ہوتا ہے۔

لے دیکھیے ضمیمہ نمبر ۱

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حُبِ وطن اور حُبِ لسان کا نسخہ جب زیادہ استعمال کیا جاتا ہے تو اس کے اندر سے منفی رجحانات نمودار ہونے لگتے ہیں۔ نہ زمین کی تحدید آخری ہو سکتی ہے اور نہ زبان کی۔ ان کے اندر تقسیم در تقسیم اور تفریق در تفریق کا عمل جاری ہو جاتا ہے۔ مرکز گریز قوتیں سرگرمِ عمل ہو جاتی ہیں۔

ع مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی

اکثریت کے اندر ایک نیا معرکہ اکثریت و اقلیت بپا ہو جاتا ہے۔ ایک نیا محاذِ جنگ کھل جاتا ہے۔ جب یہ معیار تسلیم کر لیا جائے کہ میری سرزمین سے اچھی کوئی سرزمین نہیں اور میری بولی سے اچھی کوئی بولی نہیں تو جلد یا بدیر لازماً محاذ تو کھلنا ہے۔ اِس جنگ کو کسی ایک مرحلہ پر ختم نہیں کر سکتے۔ صوبوں کے اندر نئے صوبے تشکیل پاتے رہیں گے۔ باہمی کشمکش بہر کیف جاری رہتی ہے۔

ہمسایہ ملک ہندوستان میں آزادی کے بعد صوبوں کی تشکیلِ نو کی گئی۔ یہ تشکیل لسانی وحدت کے اُصول کی بنا پر کی گئی۔ اس طرح ایک رَو کا آغاز ہو گیا۔ اب یہ رَو رُکنے کا نام نہیں لیتی۔ تقسیمِ ملک کے وقت پنجاب کے دو حصے ہو گئے۔ ایک پاکستان کے حصے میں آیا اور دوسرا ہندوستان کو ملا۔ وہ مشرقی پنجاب کہلایا۔ لسانی تحریکات کی بنا پر اب مشرقی پنجاب کے تین صوبے بن چکے ہیں۔ ہماچل پردیش، پنجاب اور ہریانہ پردیش۔ اسی طرح تقسیم ملک کے وقت بنگال کے دو حصے ہو گئے۔ ایک پاکستان کے حصے میں آیا۔ اور دوسرا ہندوستان کو ملا جو مغربی بنگال کہلایا۔ وہاں بھی لسانی تحریکات چلیں، جن کی بنا پر اب مغربی بنگال کے اندر تین صوبے بن چکے ہیں یا بن رہے ہیں۔ میزورام، جھاڑکھنڈ، گورکھا لینڈ۔ اِن کے علاوہ ہندوستان میں کتنی ہی دوسری لسانی تحریکات سرگرمِ عمل ہیں۔ ہوتا یہ ہے کہ ایک لسانی یا نسلی اقلیت اپنے لیے جداگانہ وطن کا مطالبہ کر دیتی ہے۔ مطالبہ کو عملی جامہ پہننے تک ایک طویل صبر آزما اور جان گسل راستہ طے کرنا پڑتا ہے۔ مطالبے، جلسے جلوس، ہڑتال، پولیس سے تصادم، پہیہ جام ہڑتال، جلاؤ، گھیراؤ، قتل و غارت گری، قید و بند، کرفیو،

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مارشل لا، مذاکرات، مفاہمت اور نئے صوبہ کا اعلان، بالآخر مرکزی حکومت کو جھکنا پڑتا ہے۔حقیقت یہ ہے کہ موجودہ انتخابات کا طریقہ علاقائی اور گروہی رجحانات کو تقویت۔ دیتا ہے اور ملکی اور اصولی مفادات کو پسِ پشت ڈال دیتا ہے، بلکہ قربان کر دیتا ہے۔

بعض لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ افتراق کی قوتیں اور انتشار کا عمل صرف تیسری دنیا کے ممالک میں پایا جاتا ہے۔مغربی ممالک میں نہیں پایا جاتا۔ یہ رائے سرسری مطالعہ پر مبنی ہے۔ اس رائے میں ان تمام عوامل کی کارگذاری کو ملحوظ نہیں رکھا گیا، جو افتراق اور انتشار کی قوتوں کو ابھار دیتے ہیں یا دبا دیتے ہیں۔حقیقت یہ ہے کہ انتشار کی قوتیں وہاں بھی موجود ہیں، جب ہی تو آپ دیکھتے ہیں کہ متحدہ یوروپی ریاست کا خواب چالیس سال گذر جانے کے بعد ابھی شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکا۔ لکسمبرگ، السٹر اور ڈی کن جیسی ننھی منھی ریاستیں بھی خم ٹھوک کے کھڑی ہیں۔ البتہ یہ بات ہے کہ مغربی ممالک میں انتشار کی بہ لے ابھی بہت دھیمی ہے۔

؎ دبا رکھا ہے اس کو زخم ور کی تیز دستی نے
بہت نیچے سُروں میں ہے ابھی یورپ کا واویلا

سارا کمال زخم ور کی چابک دستی کا ہے کہ اس نے مرض کو ابھی بڑھنے نہیں دیا۔

(باقی)

(بقیہ مولانا محمد چراغ کی یاد میں)

۱۹۴۸ء میں مولانا مودودیؒ گوجرانوالہ تشریف لائے، مگر مجھے اس وقت کی کوئی تفصیل یاد نہیں، البتہ جن دنوں اسلامی نظام کے لیے مہم چلا رہے تھے، میں نے خواب میں دیکھا کہ مولانا اکیلے ہی مسالہ وغیرہ لے کر شاہی مسجد کی مرمت کر رہے ہیں؛ اس سے میں یک سُو ہو گیا کہ مولانا مودودیؒ اور ان کی برپا کی ہوئی تحریک برسرِ حق ہیں۔

(باقی)

© rasailojaraid.com